مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)

(پہلی قسط)

''سرِ اقبال'' بنام ''حسین احمد''

ماضی کی ایک کہانی کا معمہ (ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب کی روشنی میں)

کتابیں لکھے اور چھاپے جانے کی موجودہ گرم بازاری میں اگر کوئی واقعی ''کتاب'' ہاتھ آجائے تو کچھ زیادہ ہی اچھی معلوم ہونا قدرتی بات ہے۔علامہ اقبال کے سوانح حیات میں علامہ کے فرزندِ ارجمند جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی ''زندہ رُود'' ایک ایسی ہی کتاب کہی جانے کی مستحق ہے۔کتاب گوتازہ بتازہ نہیں، مگر راقم سطور کے حصہ میں وہ گذشتہ دنوں ہی آئی، تین جلدوں میں ہونے کے باوجود دلچسپی کو آخر تک قائم رکھنے والی۔

برصغیر کے پڑھے لکھے لوگوں میں کم ہی ہونگے جنہیں علامہ کی شاعری سے دلچسپی نہ رہی ہو۔تھوڑی بہت راقم سطور کے حصہ میں بھی آئی۔اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ سمجھ لینے کی ہی بنا پر ہوسکتا تھا۔مگر ''زندہ رود'' پڑھ لینے کے بعد جب کسی ضرورت سے کلیاتِ اقبال کھولی تو اندازہ ہوا کہ اب بہت سے اشعار کی وہ تہیں کھل کر سامنے آئیں گی جو شاعر کی زندگی اور شخصیت سے واقفیت ہی کے نتیجہ میں کھل سکتی ہیں۔خاص کر اُن کی شاعری کا جو ایک اہم موضوع ان کی اپنی ذات ہے اس سلسلہ کے اشعار کے بارے میں تو یہ کتاب بہت صاف صاف بتائے دیتی ہے کہ اپنی کسی کمزوری کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے تو اس میں کس حد تک حقیقت ہے اور کس حد تک شاعری۔اور کہیں جو کوئی خوبی جتائی ہے تو اس کی واقعی حقیقت کیا ہے۔اسی طرح اگر علامہ کے کلام میں کہیں ایسے اشعار کسی کو نظر آتے ہیں جو ان کی شاعری کے عمومی مزاج سے جوڑ نہ کھاتے ہوں ایسے اشعار کا مسئلہ حل کرنے میں بھی یہ کتاب مددگار ہونی چاہیے۔ایسے اشعار کی ایک بہت نمایاں مثال ''حسین احمد'' کے عنوان سے کلیات کی تقریباً آخری نظم ہے، جو علامہ کی وفات سے کوئی دو ماہ قبل (فروری ۱۹۳۸ء میں) کہی گئی اور اس کی تلخی سے ملّی فضا کچھ ایسی مکدّر ہوئی کہ آج تک صاف نہ ہو پائی۔ان اشعار کا کوئی جوڑ علامہ کی شاعری کے عمومی مزاج اور ایک صاحبِ علم وفضل کی حیثیت سے ان کے مسلّمہ مقام ومرتبہ کے ساتھ کبھی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار ہوا ہے کہ یہ ''عقدۂ مشکل'' حل ہوتا نظر آیا۔اس تحریر کا اصل مقصد اسی یافت کا اظہار وبیان ہے۔

علامہ کے یہ اشعار ہمارے مخدوم ومحترم استاذِ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۷ء) کے اس نظریہ کی تردید میں سپردِ قلم ہوئے تھے کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وطنی رشتۂ اتحاد کی بنا پر سیاسی نوعیت کی متحدہ قومیت کا رشتہ نہ صرف قائم ہوسکتا ہے بلکہ ملک میں تحریکِ آزادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ یہ رشتہ قائم ہو۔وہ موقع جس پر یہ اشعار سرزد ہوئے اس نظریے کے سلسلہ میں حضرت مولیٰنا کے کسی تفصیلی اظہار وبیان کا نہ تھا، بس ایک تقریر کی اخباری رپورٹ تھی جو علامہ کیلئے اس طرح کے سخت ترین الفاظ میں ردِعمل کو کافی ہوگئی کہ:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ — زِ دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر زِ مقامِ محمدِ عربیست
بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبیست

تین شعروں کے الفاظ میں جتنی سخت باتیں سما سکتی تھیں اس کے لحاظ سے کوئی کسر یہاں نہیں رہ گئی ہے۔ تقریر اگر چہ دہلی کے ایک سیاسی جلسہ میں تھی مگر اسے ''برسرِ منبر'' ٹھیرایا گیا ہے اور وعظ یا تقریر نہیں ''سرود'' (بہ معنیٰ راگ) کا نام اسے دیا گیا ہے۔ پھر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تعلق دیو بند جیسے دینی مرکز سے مسند نشینی کا ہے مگر مرکزِ دین حضرت محمدِ عربی ﷺ کے مقام سے واقفیت کی گویا ہوا بھی نہیں لگی۔ اور پھر آخر میں نصیحت ہے کہ دین تو تمام تر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پہچاننے کا نام ہے، تم اگر ان کی ذاتِ گرامی تک نہیں پہنچ پاتے تو پھر تمہارے حصے میں جو چیز رہی جاتی ہے وہ ''ابولہبیت'' (یعنی معاذ اللہ، مصطفیٰ دشمنی) ہے۔

علامہ کے کلام میں یہ حقیقت یقیناً بے نقاب ہے کہ وہ یورپ کے پیدا کردہ وطنی قومیت کے سیاسی تخیل کو انسانیت کے لئے ایک لعنت اور خاص دین و مذہب کے حق میں تو ''کفن'' کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ''زندہ رود'' میں آپ کے اس فکر کی پوری تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ اس لئے یہ تو سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ علامہ جس چیز کو مذہب کا کفن جان رہے ہیں اس کی دعوت کسی قابل لحاظ اسلامی شخصیت کی طرف سے آئے تو وہ اس کی تردید میں ''ضبطِ سخن'' نہ کر سکیں۔ لیکن یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ حضرت مولانا مدنیؒ کا جو کہنا تھا وہ وہی تھا جس کی حضرت علامہ کے فکر اور فہم اسلام میں گنجائش نہ تھی، تب بھی اس آخری درجہ کے جارحانہ انداز تردید کی توقع، جس سے اُن کے اظہارِ مدّعا سے زیادہ فریقِ ثانی کی معلوم و معروف حیثیتِ عرفی کو خاطر میں نہ لانے کا اظہار ہوتا ہے، ان کے جیسے مرتبہ کی شخصیت سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ اشعار میں ''دیو بند'' کا حوالہ دلیل ہے کہ علامہ پر ''حسین احمد'' کی نہایت قابلِ لحاظ حیثیت عرفی مخفی نہ تھی۔ بلکہ یہی چیز گویا باعث ہوئی کہ وہ ان کی مبینہ تقریر پر نکتہ چیں ہوں۔ پھر آخر کیونکر یہ ممکن ہوا کہ اس تقریر کا حوالہ ''سرود بر سر منبر'' کے توہین آمیز الفاظ میں آئے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر ''چہ بے خبر زِ مقام محمدِ عربیست'' فرماتے ہوئے علامہ یہ بھی نہ سوچیں کہ یہ وہ کس کے بارے میں فرما رہے ہیں؟ اور پھر کسے ''بہ مصطفیٰ برساں خویش'' کا سبق دے رہے ہیں، وہ کہ جس نے مدتیں درِ مصطفیٰ پہ فقیرانہ گزاری ہیں، اور جس کا دیو بند میں شغل ہی درسِ حدیثِ مصطفیٰ ہے؟

کیا یہ کہا جائے کہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی جو دولت علامہ کو نصیب سے مل گئی تھی اس کے حوالے سے وہ خود بھی معاذ اللہ اُسی خامی کا شکار ہوئے جس کا گلہ واعظِ زاہد کے بارے میں کرتے ہوئے فرما گئے ہیں:

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بند گانِ خدا پر زباں دراز کرے

یہ علامہ کی شدتِ بے پناہ کے مقابلے میں محض ایک ہلکے سے شکوے کا پیرایہ ہوگا، مگر ایسا کہنا وہی پسند کرے گا جسے اندازہ نہیں یا وہ بھول گیا ہے کہ علامہ کے عشقِ مصطفیٰ سے قدرت نے کیا کام اُن کی شاعری کے حق میں لیا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر خود حضرت مولانا علیہ الرّحمۃ نے علامہ کی اس سراپا آتش تنقید کے جواب میں جس پاس و لحاظ سے کام لیا ہے، اس کے ہوتے ہوئے آپ کے ایک کفش بردار کو کہاں زیبا کہ وہ کوئی الگ راہ چلے! علامہ کی اُٹھائی ہوئی اس بحث کے سلسلہ میں ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے جو ایک مقالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر تحریر فرمایا وہ مکمل ہونے نہ پایا تھا کہ علامہ نے وفات پائی۔ اس ناگہانی خبر کے حوالہ سے اس مقالہ کی تمہید میں رقم طراز ہوئے ہیں:

''......جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصدِ اصلی سے نقاب اُٹھانا چاہتا تھا ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے وصال کی خبر شائع ہوئی۔اس ناسزا ودلگداز خبر نے خیالات وعزائم افکار پر صاعقہ کا کام کیا۔طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہوگئے۔''

پھر آئندہ صفحہ پر یہ کہنے کے لئے کہ ڈاکٹر اقبال صاحب اگر چہ مجھ سے اس درجہ فائق وبرتر تھے کہ میں گویا ان کے سامنے طفلِ ابجد خواں، مگر ہندوستانی سیاست کے مسئلے میں ساحرانِ فرنگ کے سحر کا شکار ہوگئے تھے، اور ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بڑے غلطی کر جاتے جبکہ چھوٹے محفوظ رہتے ہیں' فرمایا کہ:

''یہ امر یقینی اور غیر قابل انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور انکے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔وہ آسمانِ حکمت وفلسفہ، شعر وسخن، تحریر وتقریر، دل ودماغ اور دیگر کمالات علمیہ اور عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔مگر باوجود کمالات گوں ناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہوجانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں:

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بر ہدف برزند تیرے

(کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نادان بچے کا تیر نشانہ پر بیٹھ جائے)

اے کاش! علامہ اپنے ہدف کے اس ردّعمل کو دیکھنے کے لئے زندہ رہے ہوتے! یہ راقم نہیں سمجھتا کہ مرحوم علامہ نے یہ تحریر پڑھی ہوتی تو اس بے نفسی اور خاک ساری کے لئے اپنی زندگی کا کوئی ایسا دوسرا تجربہ وہ یاد کر پاتے۔اور یقین کیا جاسکتا ہے کہ علامہ کے ساتھ ''سر'' کا برطانوی خطاب اگر نہ لگا ہوتا تو متحدہ قومیت کی بابت آپ کی رائے میں برطانوی سحر کا دخل سمجھنے کی بات بھی ہمیں حضرت والا کی اس عبارت میں نہ ملتی۔

الغرض، اگر حضرت مولانا قومیت کا وہ نظریہ پیش کر رہے ہوتے جو حضرت علامہ کے فہمِ اسلام سے سیدھا ٹکراتا تھا تب بھی اس پر ردّعمل کا یہ پیرایۂ اظہار کہ مسند نشین دیوبند کو بیک جنبشِ قلم ''بولہبی'' تک پہنچا دیا جائے، یہ علامہ سے کسی قدر کم درجہ کی فہمیدہ وسنجیدہ شخصیت سے بھی بآسانی سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔لیکن مولانا کی تقریر کو توفی الواقع دور کا بھی تعلق اُس بات سے نہ تھا جو حضرت علامہ کو اس قدر ناگوار گزری۔علامہ جس وطنی قومیت کو ''مذہب کا کفن'' سمجھتے تھے مولانا بھی اُسے ایسا سمجھنے میں علامہ سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بہرحال نہ تھے۔مگر لگتا ہے کہ معاملے کے ایک خاص پس منظر کی بنا پر علامہ کو اپنا ہی بیان کردہ یہ نکتہ فراموش ہوگیا تھا کہ:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

وہ تحریکِ خلافت جس سے ''زندہ رود'' کے بیان کے مطابق علامہ دور اور نفور رہے اور جس میں حسین احمد کا مولانا محمد علی جوہرؒ وغیرہ کے ساتھ وہ جانبازانہ حصہ تھا جس کی تفصیل کے لیے ان لوگوں پر چلائے گئے مقدمۂ کراچی (۱۹۲۱ء) کی روداد پڑھنی چاہئے۔یہ اس اسلامی خلافت کو بچانے کے لئے ہی اٹھائی گئی تحریک تو تھی جس کا ازروئے وطن ہندوستانی

مسلمانوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں وہ اسلامی رشتہ ان کا اس کے ساتھ تھا جو جغرافیائی حدود و قیود سے بالاتر ہے۔ اور یہ خلافتی جدوجہد اسی متحدہ قومیت کے ساتھ تھی جس کا حوالہ مولانا مدنی کی زیر بحث تقریر میں آیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس تحریک نے مہاتما گاندھی کو اپنی سربراہی کے لئے قبول کر لیا تھا۔ اور ایسا ہونے میں ''حسین احمد'' سے کہیں زیادہ حصہ مولانا محمد علی جوہرؒ کا تھا، جن سے برتر اسلامیت کا دعویٰ شاید علامہ اقبال کو بھی نہ ہوا ہو۔ یہی وہ ''متحدہ قومیت'' تھی جس کا حوالہ مولانا اپنی تقریر میں دے رہے تھے۔ نہ کہ وہ جو علامہ کے تصور میں تھی جس میں مسلمان' مسلمان نہیں رہ سکتا۔

حضرت حسین احمدؒ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ کی سیاسی زندگی ۱۹۱۷ء سے شروع ہوتی ہے جب کہ خلافتِ عثمانیہ کے باغی شریف حسین نے مکہ میں اُن کو ان کے محترم استاذ شیخ الہند محمود حسنؒ کے ساتھ گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا، اور پھر انگریزوں نے ان کو اپنی حکومت کے خلاف باغیانہ عزائم کے حوالے سے جزیرہ مالٹا میں چار سال قید رکھا۔ چار سال بعد ۱۹۲۰ء کے شروع میں ان حضرات کی رہائی عمل میں آئی۔ شیخ الہند کی یہ گرفتاری بے وجہ نہ تھی۔ یہ جنگ عظیم اوّل کا زمانہ تھا کہ آپ برطانوی حکومت کے خلاف ایک مکمل باغیانہ اسکیم لے کر ہندوستان کے باہر نکلے تھے۔ حجازِ مقدس کو اولین منزل بنایا۔ اس لیے کہ وہاں حج کے زمانہ میں ان میں سے بیشتر لوگوں سے رابطہ آسان ہو سکتا تھا جن سے رابطہ ہوا بھی، مگر قسمت سے اسی زمانہ میں شریف مکہ حسین پر انگریزوں کے ڈورے کام کر گئے اور حجاز مقدس عثمانی خلافت کے اقتدار سے نکل گیا۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند رہا ہوئے تو بڑھاپے اور قید کے شدائد نے زار و نزار کر دیا تھا۔ نومبر ہی میں آپ کی شمع حیات گل ہو گئی، اور پھر برطانوی حکومت کے خلاف آپ کے مشن کی علمبرداری ''حسین احمد'' کے حصہ میں آئی۔ اسیرانِ مالٹا نے جب رہائی پائی تو اس سے پہلے خلافت تحریر شروع ہو چکی تھی۔ اور یہ صرف مسلمانوں کی نہیں تمام ہندوستانیوں کی تحریک بن گئی تھی، جس میں ہندو اکثریت کے سب سے بڑے نمائندہ مہاتما گاندھی پیش پیش تھے۔ شیخ الہند جن کا تحریکِ خلافت کی پوری مسلم قیادت نے مع گاندھی جی کے بمبئی پہنچ کر نہایت پر جوش استقبال کیا تھا، اس تحریک کے لیے سب سے بڑی اسلامی اتھارٹی کے حامل مانے گئے۔ اور آپ نے جس متحدہ تحریک اور اس کے پروگرام عدم موالات (نان کوا پریشن) پر مہر تصویب ثبت فرمائی۔ اسی پر عمل درآمد کے نتیجہ میں ''حسین احمد'' پر مولانا محمد علی جوہرؒ وغیرہ کے ساتھ بغاوت کا مشہور مقدمہ کراچی چلا۔ اور دو دو سال کی جیلیں ہوئیں۔

یہ ہے حسین احمد کے اس نظریۂ متحدہ قومیت کا پس منظر جس کا آپ کی ۱۹۳۸ء کی اس تقریر میں حوالہ ایک طوفان اُٹھا گیا۔ یعنی یہ وہی متحدہ قومیت تھی جس کے جھنڈے کے نیچے تحریکِ خلافت کے دور میں علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح جیسے خال خال افراد کو چھوڑ کر مسلم ہندوستان کی وہ تمام ہستیاں سرگرم رہی تھیں جن کی طرف ملّی مسائل کے لیے لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ علامہ اقبال ''حسین احمد'' سے کچھ زیادہ واقف ہوں یا نہ ہوں متحدہ قومیت والی بات کے اس پس منظر سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ تحریک خلافت سے ان کے بے تعلق رہنے کی تو ایک اہم وجہ یہی تھی۔ مگر یہ دینی حوالے سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''قیام انگلستان کے دوران جب وہ (ذہنی) انقلاب سے گزرے اور انہی ایام میں برّصغیر میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا تو اقبال' سرسید احمد خان کے سیاسی مکتبۂ فکر کو درست خیال کرتے

ہوئے ذہنی و قلبی طور پر اس سے وابستہ ہو گئے۔ سر سید کے سیاسی مکتبۂ فکر کی منطق یہ تھی کہ...... جمہوریت کے ذریعہ قومیتِ متحدہ کی بنیاد تبھی رکھی جا سکتی تھی جب ہندو اور مسلمان مرکزی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہوں۔ لیکن فرقہ وارانہ منافرت کے سبب ہندو ایسی صورت کو قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ پس برصغیر میں قومیت متحدہ کا تخیل خیالِ خام تھا۔ (زندہ رود۔ جلد سوم صفحہ ۲۹۱-۹۲)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں اصولاً متحدہ قومیت سے انکار نہ تھا۔ نمائندگی میں برابری کی شرط کے ساتھ وہ منظور تھی۔ پس علامہ کے اس سیاسی فکر و عقیدہ کا بے شک یہ حق تھا کہ کوئی آواز اس شرط کے بغیر متحدہ قومیت کے حق میں بلند کی جا رہی ہو تو اسے چیلنج کریں۔ مگر اس کے لیے سیاسی زبان کے بجائے یہ دینیات کی زبان کا سوال کیونکر پیدا ہو گیا؟ اور وہ بھی ایک اعلیٰ درجہ کے مستند و مسلّم عالم دین کے مقابلے میں! جب کہ علامہ اسلامی دینیات پر کتنا بھی عبور اپنے مطالعہ کی بنیاد پر رکھتے ہوں مگر ان جیسے ذی فہم کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس عبور کو باضابطہ تحصیل کا ہمسر سمجھتے ہوں گے۔ اور اگر سمجھتے بھی ہوں تب بھی جوزعم و پندار آمیز لہجہ انہوں نے اس چیلنج میں اختیار فرمایا وہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ضرور اس کے پس منظر میں کچھ خاص حالات و معاملات ہونے چاہئیں۔ ورنہ یہ علامہ کے مقام سے فروتر بات تھی اور قطعاً غیر متوقع بات تھی۔ ''زندہ رود'' نے انہیں خاص حالات سے پردہ اٹھانے کا کام انجام دیا ہے۔

کم سے کم راقم سطور کے علم میں اس سے پہلے نہ تھا کہ حضرت علامہ نے برصغیر کی سیاست میں کوئی سرگرم عملی حصہ بھی لیا، کُل ہند مسلم لیگ کی سیاست سے ان کا عملی تعلق صرف ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت الٰہ آباد کی حد تک معلوم تھا۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں جب علامہ نے لاہور سے پنجاب صوبائی کونسل کا انتخاب لڑا تب سے مسلم لیگ سے ان کی وابستگی جو پہلے بس فکری درجہ کی تھی سرگرم عملی وابستگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور اس رشتہ کی یہ سرگرمی ٹھیٹھ سرسید مکتب فکر والی لائن پر تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا جس کو ہندوستان کے لئے آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھیں اور اس کمیشن میں تمام کے تمام انگریز تھے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں لیا گیا تھا۔ تو اس پر کانگریس نے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ مسلم قائدین میں خود مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کا یہی فیصلہ تھا۔ مگر اقبال اس کے برعکس اپنے صوبائی صدر سر محمد شفیع کے ساتھ اس کمیشن کے تعاون کے لئے اس حد تک گئے کہ مسلم لیگ، جناح لیگ اور شفیع لیگ کے دو ٹکڑوں میں بٹ گئیں۔ اوری دونوں لیگیں پبلک سطح پر ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں۔ چنانچہ جب مسٹر جناح نے دوسرے مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر ایک بیان کمیشن کے مقاطعہ کے لئے شائع کیا تو اس کے ردّعمل میں علامہ اقبال نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ ایک بیان دیا جس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا:

''ہم نہایت جرأت اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کرایہ کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمیشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جا سکتیں......'' (صفحہ ۳۳، ۳۴)

پنجاب مسلم لیگ جس کے علامہ صاحب سیکرٹری تھے اور سر محمد شفیع صدر، اس کی اِس روش پر مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''سر محمد شفیع سے بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں۔انہوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے۔پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سر محمد اقبال جیسے لیڈر سر محمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزاد خیالی کی سطح تک ابھار کر نہ لا سکے بلکہ برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر اتر آئے ہیں۔چنانچہ کمیشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان اس کے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چاپلوسی کا ہے۔'' (ص ۳۳)

علامہ صاحب اِس درجہ کامل ''سرسیدی'' تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے صریح بیان کے مطابق تھے ہی، اس پر مزید یہ کتاب یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ برصغیر کے معاملات کو ایک حد تک پنجابی صوبائیت (یا کہیے علاقائیت) کی سطح سے دیکھنے والوں میں بھی شامل ہو گئے تھے۔سائمن کمیشن کے بارے میں ان کے جس بیان کے آخری فقرے اوپر نقل کئے گئے ہیں اسی بیان میں ہے:

''جن مسلمانوں نے مسٹر جناح کے اعلان پر دستخط کئے ہیں ان میں سے بعض تو ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ان کی روش پنجاب اور بنگال ایسے صوبوں کے مسلمانوں کی حکمت عملی کو تبدیل یا وضع نہیں کر سکتی۔'' (ص ۳۴)

اسی طرز فکر کا اظہار ان کے مسٹر محمد علی جناح کے نام ایک خط سے بھی ہوتا ہے جو ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء کو لکھا بتایا گیا ہے۔اس خط میں تحریر فرماتے ہیں: (آخری جملہ جو ہم نے زیر خط کر دیا ہے وہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ع)

''.....میرے خیال میں نیا آئین ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ وتسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا۔یعنی مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جدا گانہ وفاق کا قیام .....میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمالی مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔'' (ص ۳۲۸)

کیا یہ طرز کلام انہیں علامہ اقبال کا ہو سکتا ہے جنہیں ہم ''عشق کے دردمند'' کے طور پر جانتے آئے تھے؟ اور جن کی آفاقیت نے کہا تھا:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

نیز ارشاد ہوا تھا:

تو ابھی رہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گزر ، پارس و شام سے گذر

نہیں، یہ دراصل اُن کے اندر ۱۹۲۷ء سے پروان چڑھنے والی ایک نئی شخصیت کا ظہور تھا جو ۱۹۳۷ء کے اُس معرکہ انگیز سال میں اپنے کمال کو پہنچ گئی نظر آتی ہے جس میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت ہونے والے الیکشن کے بعد یوپی کی وزارت سازی کے مسئلہ پر لیگ اور کانگریس کے درمیان کبھی نہ پٹنے والی خلیج پیدا ہوئی اور محمد علی جناح بھی سرسید والے دوقومی

نظریے کو اپنانے کی طرف چل پڑے۔ اور یہ ۱۹۳۷ء وہ سال تھا کہ علامہ کی ۱۹۳۴ء سے شروع ہونے والی علالت اپنی آخری حدیں چھونے لگی تھی۔ اور بالآخر اپریل ۱۹۳۸ء میں شمعِ حیات ہی گل کر گئی۔ زندگی کے اس مرحلے میں علامہ کے لئے یہ صورت حال کس قدر تسکین بخش رہی ہوگی کہ وہ اپنے جیتے جی مسٹر محمد علی جناح کو فکری طور پر وہیں پہنچتا ہوا دیکھ رہے ہیں جہاں ان کو پہنچانے کے لئے وہ ۱۹۲۷ء سے کوشاں ہوئے تھے۔ ایسے میں ناگاہ ان کے کان میں آواز آتی ہے کہ مسندِ آرائے دیو بند مولینا حسین احمد مدنی اس دوقومی نظریہ کی راہ میں حائل ہونا چاہتے ہیں تب......اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے......ان کا اس پر یہ بھڑک اُٹھنے والا انداز کچھ غیر متوقع نہیں رہتا۔ آخر کو انسان تھے۔

صحت کے اعتبار سے علامہ کے ضعف کا یہ عالم بھی یہاں ملحوظ رہے کہ فروری میں کہے گئے ان اشعار کے سلسلہ میں چھڑ جانے والی بحث پر جب علامہ نے اپنی بات مدلل کرنے کے لئے ایک مفصّل بیان کی ضرورت سمجھی، تو خود اس قابل نہ تھے کہ اس کو لکھ سکیں، بلکہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق یہ کام ان کے خاص معاونین، چودھری محمد حسین وغیرہ نے انجام دیا (ص ۳۶۸) اور خود اشعار بھی اپنے معنوی پہلو سے اس گواہی کے لئے کم نہیں کہ علالت کے اثرات ایسے ہی غیر معمولی درجہ پر پہنچ چکے تھے۔ ورنہ اگر کسی نے ''ملّت از وطن است'' کا سرود ''برسرِ منبر'' الاپنے کا ارتکاب کیا بھی تھا تو ''مقام محمد ﷺ'' کی معرفت تو بہت آگے کی چیز، یہ تو اس شخص کے دین محمد ﷺ کی الف با تا سے بھی بے خبری کی دلیل ہے۔ پھر یہاں کیا محل کہ مقام محمد ﷺ سے بے خبری کی طعن کی جائے؟ اور وہ کہ جو دینِ مصطفیٰ ﷺ کی الف با تا سے بھی بے خبر پایا جارہا ہو 'اُسے کیا سمجھ آئے گی کہ ''مصطفیٰ برساں خویش را'' میں علامہ نے کیا فرمایا؟ مگر چونکہ علامہ کے یہاں اصل دین اور دینداری حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے جذباتی تعلق ہے، جیسا کہ ان کی شاعری سے عیاں ہے۔ اور اسی کو جناب رشید احمد صدیقی مرحوم نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ ''اقبال پر دنیا کے بڑے مذہب کی گرفت اتنی نہیں جتنی ایک بڑی شخصیت کی ہے۔'' (اور اسی سے ان کی عملی دینی کمزوریوں کا عقدہ حل ہوجاتا ہے جو کچھ ایسی راز بھی نہ تھیں، اور ڈاکٹر جاوید نے تو ان کو اس درجہ کھول کر بیان کردیا ہے کہ اچھا تھا اگر وہ یہ نہ کرتے۔) پس ان اشعار کے معنوی پہلو کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انحطاطِ قویٰ کے اس عالم میں جب علامہ نے ''ملت از وطن است'' کے ''سرود'' پر گرفت کے ارادہ سے قلم اُٹھایا تو وہ موقع و محل کی رعایت کرنے کے بجائے بے ساختہ اسی راہ پر رواں ہوا جس کا وہ عادی تھا۔

الغرض علامہ ان اشعار کی تسوید کے وقت جن خاص حالات کے ماحول میں اور صحت کی جس منزل میں تھے اس کے پیشِ نظر ان کا یہ غیر متوقع کلام کچھ ایسا نا قابلِ فہم نہیں رہتا۔ صد شکر کہ علامہ کو انتقال سے پہلے اس کا موقع میسّر آ گیا کہ اس قضیۂ نامرضیہ کی وراثت چھوڑ کر نہ جائیں۔ حضرت مولانا کی طرف سے کی گئی ایک وضاحت آپ تک پہنچی، جس کے حوالہ سے یہ اعلان اخبارات میں چھپوایا کہ اس کے بعد مولانا پر اعتراض کا کوئی حق انہیں نہیں رہتا۔ افسوس آپ کے لوگوں نے آپ کے بعد آپ کا جو مجموعۂ کلام ''ارمغان حجاز'' چھپوایا تو اس میں ان اشعار کو شامل کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ زندہ رود میں اس سوال کا جواب بھی آیا ہے۔ اور اس سے اُن ''خاص حالات'' کے غیر معمولی اثرات کی مزید توثیق ہوتی ہے جن کے حوالہ سے علامہ کے بالکل غیر متوقع طرزِ کلام کی توجیہ ممکن ہوئی۔ علامہ کے رجوع کے بعد ان اشعار کو ان کے نامہ اعمال میں برقرار رکھنے کا جواز بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مولانا نے بعد میں ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے نام سے جو رسالہ چھاپا وہ

وضاحت کے برعکس تھا۔ پھر اس میں علامہ کی توہین کرتے ہوئے انہیں ساحرانِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا قرار دیا گیا اور ''کودکِ ناداں'' کے لقب سے نوازا گیا۔ (ص ۳۷۰) ''اس بیانِ جواز میں صرف یہی نہیں ہے کہ ساحرین برطانیہ کے سحر میں آجانے کی جو بات حضرت مولانا نے محض ایک بشری کمزوری کے طور پر کہی تھی، جس کی زد میں ہر شخص آسکتا ہے، اسے طنز و ملامت پر محمول کرلیا گیا بلکہ اس ستم سے بڑھ کر یہ کہ ''کودکِ ناداں'' والا شعر جو صاف طور پر حضرت مولانا نے، ازراہِ عجز و انکسار، اپنے حق میں لکھا ہے اسے حضرت علامہ کے حق میں پڑھ لیا گیا۔ حالانکہ ''زندہ رُود'' پڑھ کر کسی ایسے شبہ کی ادنیٰ گنجائش نہیں رہتی کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی اردو فارسی اتنی کمزور ہو تو پھر اس برعکس فہم کی ذمہ داری کے لیے نظر سوائے مسلم لیگ اور کانگریس کی ہوشربا کشمکش والے ان حالات کے، اور کس طرف جائے جو مسٹر جناح سے مولانا آزاد کو ''شو بوائے'' کہلوادیں اور علامہ کی زبان پر شیخ دیوبند کے لئے ''بولہبی'' کی وعید جاری کرادیں۔

☆......☆......☆

اس تحریر کا اصل مدعا تو پورا ہو گیا۔ یوں اور کافی باتیں اس میں ایسی ہیں کہ نقل کر دینے کی گنجائش ہو تو سب کام کی۔ تاہم ان میں ایک دو جو موجودہ مادّیت اور زر پرستی کے دور میں ''قندیلِ رُہبانی'' کا سامنظر پیش کرتی ہیں ان کی گنجائش تو نکالنی ہی چاہئے۔ شاید ہم میں سے کچھ لوگوں کے دل ان میں پوشیدہ نصیحت سے جاگ پڑیں، کہ بہت اندھیری چھائی ہے۔ اور یہ نصیحت علامہ کی شاعری کے خاص موضوعات میں سے ہے۔

''علامہ کے سفرِ افغانستان کے حوالہ سے وہاں کی معروف شخصیت ملّا شور بازار کے یہاں حاضری کا جو ذکر آیا ہے تو بے تاج بادشاہ کا درجہ رکھنے والی اس شخصیت کے مکان کی کیفیت بھی قابل ذکر پائی گئی۔ لکھا ہے کہ وہ ''ایک تنگ گلی کے اندر تھا اور ہر قسم کے تزک و احتشام اور ظاہری آراستگی سے خالی۔ باقاعدہ نشست گاہ بھی نہ تھی۔ زنانہ مکان تھا جہاں پردہ کرا کر ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ انہیں ایک لمبے کمرہ میں لے جایا گیا جس میں ایک طرف یک پلنگ بچھا تھا اور باقی زمین پر سادہ فرش بچھا تھا۔'' (ص ۲۳۶)

علامہ کو ان کی زندگی کے آخری سالوں میں علالت کے ساتھ ساتھ معاشی پریشانی نے بھی گھیر لیا تھا۔ آپ کے دوست اور قدرداں سر راس مسعود (وزیر تعلیم ریاست بھوپال) کی کوشش سے ریاست سے آپ کے لئے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات کا وظیفہ منظور ہوا۔ سر راس مسعود نے اس کی اطلاع کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ وہ کوشاں ہیں کہ بھوپال کے علاوہ حیدرآباد، بہاولپور وغیرہ بھی ان کے لئے وظیفے جاری کریں۔ اس کے جواب میں علامہ کا خط نقل کیا گیا ہے:

''آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں اُن کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔'' (ص ۲۶۸)

(جاری ہے) (مطبوعہ: ''الفرقان'' لکھنؤ۔ مئی ۲۰۰۵ء)